© rasailojaraid.com

پاکستان، جنوبی افریقہ اور پھر پاکستان

سعید احمد اکبرآبادی

(۴)

جب یہ ہنگامۂ نائو نوش ختم ہوا اور لوگ منتشر ہوگئے تو چونکہ لنچ کا انتظام یہیں تھا اس لیے ہم بجائے ہوٹل واپس جانے کے اسی بلڈنگ میں ٹھہر گئے اور ادھر اُدھر دو چار احباب باتیں کرنے لگے، لنچ میں ابھی دیر تھی اور ظہر کی نماز کا وقت ہوگیا تھا، اسی بلڈنگ کے ایک بڑے کمرہ میں نماز کا اہتمام تھا، بڑے بڑے قالین بچھے ہوئے تھے، وضو وغیرہ کے لیے باتھ روم موجود تھے، میں اور میاں اسلم ہم دونوں وضو سے فارغ ہوکر نماز کے کمرہ میں پہنچے تو جماعت تیار تھی، ہم اس میں شریک ہوگئے، ایک عرب مندوب امامت کر رہے تھے، میں نے متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں میں دیکھا ہے کہ عرب مندوبین ظہر کے ساتھ عصر اور مغرب کے ساتھ عشاء کو باجماعت پڑھتے ہیں، چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ ظہر کی دو رکعت نماز قصر سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ عصر کی نماز کے لیے جماعت کھڑی ہوگئی، میں اس میں شریک نہیں ہوا، بعد میں ایک سوڈانی دوست نے پوچھا: آپ ہمارے ساتھ عصر کی نماز میں شریک کیوں نہیں ہوئے؟ میں نے کہا: میں سفر میں یا اور کسی ناگزیر مجبوری کی حالت میں جمع بین الصلوٰتین کے جواز کا قائل ہوں اور جب میں فی الحقیقت ریل میں یا ہوائی جہاز میں ہوتا ہوں تو اس پر عمل بھی کرتا ہوں، لیکن قیام کی صورت میں جمع نہیں کرتا اور ہر نماز اس کے اپنے وقت پر پڑھتا ہوں، میں نے مزید کہا: آپ حضرات کا عمل یعنی قیام کے دنوں میں بھی جمع بین الصلوٰتین اور جمع کی بھی یہ صورت کہ ظہر کا وقت ابھی شروع ہوا ہے اور آپ نے عصر کی نماز بھی پڑھ ڈالی میں اسے ناجائز تو نہیں کہہ سکتا، لیکن میرے نزدیک افضل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مزید یہ:

میں نے ایک بات یہ بھی دیکھی ہے کہ سفر تو سفر حضر میں بھی سنن و نوافل کا خیال بہت کم کرتے ہیں۔ عرب ممالک میں عام طور پر دیکھا ہے کہ مغرب کی جماعت ختم ہوئی کہ مسجد فوراً خالی ہو جاتی ہے، اس کے بالمقابلہ ہمارے ہاں سنن و نوافل کا یہ التزام ہے کہ سفر میں ہیں اور صلوٰۃ الاوابین پڑھ رہے ہیں، ریل میں جا رہے ہیں اور ظہر کے سنن و نوافل دونوں ادا کر رہے ہیں۔ میرے نزدیک عرب اور ہم دونوں افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ صراطِ مستقیم صرف اتباعِ سنت کا نام ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عمل جس طرح کیا ہے، ہمیں بھی وہ عمل اسی طرح کرنا چاہیے، ورنہ ہم احداث فی الدین کے مرتکب ہوں گے۔ افسوس ہے ہمارے فقہا اور صوفیا نے اس حقیقت کا لحاظ کم رکھا ہے --------------

اور اسلام میں بھانت بھانت کے جو فرقے پیدا ہوئے ہیں میرے نزدیک اس میں ایک بڑی حد تک دخل اس بات کا بھی ہے کہ ہم نے لاشعوری طور پر قرآن کے حکم: وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا "رسول جو کچھ تم کو دیں وہ لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے رک جاؤ" اور "وَلَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" "اور اے مسلمانو! تمہارے لیے رسول اللہ ہی بہترین نمونۂ عمل ہیں" یہ اور اس جیسی دوسری آیات و احکام کو نظر انداز کر دیا ہے، خیر! نماز سے فراغت کے بعد لنچ ہوا۔ تین بجے میوزیم جانے کا پروگرام تھا، لیکن لنچ کے بعد مجھے قیلولہ کی عادت ہے اور اعلیٰ درجہ کے مغلئی کھانے جو ابھی تناول کیے تھے ان کے بعد تو قیلولہ واجب ہو جاتا ہے، اس لیے میں سید ھا ہوٹل چلا گیا اور میوزیم نہیں گیا، ڈنر ہوٹل میں ہی تھا اس لیے کہیں آنا جانا نہیں ہوا۔

دوسرے دن یعنی ۸ مارچ کی صبح کو نو بجے سیمینار کا آغاز ہوا، مندوبین دو کمیٹیوں میں بٹ گئے تھے، ایک کمیٹی نمبر ایک اور دوسری کمیٹی نمبر ۲، مجلس منتظمہ نے مقالات کے عنوان اور موضوع کے حساب سے مندوبین کو خود کمیٹیوں میں تقسیم کر دیا تھا، میرا نام کمیٹی نمبر ا میں تھا اور میرا خیال ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے والوں کی اکثریت اسی کمیٹی میں تھی، کمیٹی نمبر ا کے اجلاس نیشنل اسمبلی ہال میں ہوتے تھے اور کمیٹی نمبر ۲ کے سینٹ ہال میں۔ مقالہ کی زبان اردو، انگریزی یا عربی ہو سکتی تھی۔ دونوں ہالوں میں ان زبانوں میں فوراً ترجمہ کا انتظام بہت اچھا تھا۔ آپ کسی کی تقریر کو ان میں سے کسی زبان میں بھی سننا چاہیں اس زبان کا نمبر دبا کر گھما دیجئے اور آلہ سماعت کو کان سے لگا لیجئے تقریر کسی زبان میں ہو رہی ہو، آپ بہرحال اسکو سنیں گے اسی زبان میں جس میں آپ سننا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے اس نظام کا تجربہ مجھ کو ۱۹۶۴ء میں قاہرہ کی مجمع البحوث الاسلامیہ کی کانفرنس میں ہوا تھا۔ کانفرنس کی سرکاری زبانیں تین تھیں: عربی، انگریزی اور فرانسیسی، ترجمہ کرنے والی تینوں لڑکیاں تھیں، وہ اس پھرتی اور خوبی سے ترجمہ کرتی تھیں کہ ترجمہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا، ایسا لگتا تھا کہ مقالہ پڑھ رہی ہیں، مجھے سخت حیرت ہوئی، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان لڑکیوں کی ٹریننگ فرانس میں ہوئی ہے، اور اب تو روزمرہ کی چیز ہو گئی ہے، جس بین الاقوامی کانفرنس میں جائیے یہ سسٹم موجود ہے۔

دونوں کمیٹیوں کے اجلاس ۸ر اور ۹ر مارچ کو چار چار اور ۱۰ر کو دو، اس طرح ہر کمیٹی کی نشستیں دس ہوئیں جن میں مقالات پڑھے گئے اور ان پر مذاکرہ ہوا، پھر آخری دن یعنی ۱۰ کو سہ پہر میں دونوں کمیٹیوں کا مشترکہ اور کانفرنس کا اختتامیہ اجلاس ہوا جس میں چند تجاویز منظور ہوئیں اور چند خاص لوگوں نے مختصر مختصر تقریروں میں مندوبین کے نمائندوں کی حیثیت سے کانفرنس کے متعلق اپنے تاثرات بیان کیے اور پاکستان گورنمنٹ کا شکریہ ادا کیا۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے میرا نام کمیٹی نمبر ا کی فہرست میں تھا۔ اس کمیٹی کا پہلا اجلاس ۹ بجے شروع ہوا تو اس وقت ڈائس پر صدر مجلس استقبالیہ جناب اے۔ کے۔ بروہی تشریف رکھتے تھے، پروفیسر منظور الدین احمد، صدر شعبہ سیاسیات کراچی یونیورسٹی اور ڈاکٹر [illegible] جنرل وزارت امور مذہبی، اسلام آباد۔ یہ دونوں حضرات ہماری کمیٹی کے [illegible] کرنے کا کام انجام دیتے رہے تھے اور پہلے اجلاس کی صدارت [illegible]

© rasailojaraid.com

اسماعیل راجی الفاروقی کا سجادہ آ گئے نہ تھے اس لیے اس کی صدارت موصوف کی امریکی مسلمان اہلیہ ڈاکٹر لوئس لمیا الفاروقی نے کی ۔ میاں بیوی دونوں امریکہ کی ٹمپل یونیورسٹی، فلاڈلفیا کے شعبۂ مذہب و فنون میں استاد ہیں، دونوں بڑے لائق و قابل اور متعدد کتابوں اور مقالات کے مصنف ہیں۔ بیگم سے یہاں ملاقات اور گفتگو ہوئی تو یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ وہ نام کی نہیں بلکہ درحقیقت عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے پکی اور سچی مسلمان ہیں —— اور درحقیقت یورپ اور امریکہ جہاں ہر شخص مکمل آزاد ہے اور اپنے فکر و عمل میں کسی لالچ اور دباؤ کو بالکل نہیں مانتا وہاں کسی نو مسلم کے برائے نام مسلمان ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں، خود میرے ذاتی دوستوں اور ملاقاتیوں میں مغربی ممالک کے چند نو مسلم مرد اور خواتین ہیں جن کی مذہبی اور اخلاقی زندگی ہم جیسے لاکھوں خاندانی مسلمانوں سے کہیں زیادہ بہتر اور قابل رشک ہے۔
ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ —— علاوہ ازیں اگرچہ بیگم فاروقی کا اصل موضوع تدریس و تحقیق اسلام کے فنون لطیفہ ہیں، لیکن ان کی گفتگو اور بعض ان کے مقالات جو میری نظر سے گذرے ہیں ان سے اندازہ ہوا کہ ان کا قرآن و حدیث، تاریخ اسلام اور تصوف کا مطالعہ بھی وسیع اور عمیق ہے۔

ان محترمہ کے شوہر نامدار ڈاکٹر اسماعیل راجی فاروقی جو اصلاً مصری ہیں اور ایک مدت سے امریکہ میں ہیں اُن سے میری ملاقات نہیں ہے لیکن ۱۹۶۲ء میں جب میں کناڈا کی میکگل یونیورسٹی کے اسلامک ریسرچ اینڈ اسٹڈی انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ہوا تو معلوم ہوا یہاں رہ کر انھوں نے ایک کتاب لکھی تھی جو وہاں میرے قیام کے زمانہ میں طبع ہو کر آ گئی تھی اور میں نے اسے پڑھا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب عرب ملکوں اور خصوصاً مصر و شام اور لبنان و عراق کے سر پر عربی قومیت کا بھوت سوار تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر فاروقی کی کتاب کا موضوع بھی یہی تھا اور اس کا نام انگریزی میں Arabacism اور عربی میں العروبة تھا۔ میں نے اس کتاب کو اول تا آخر پڑھا تو سخت افسوس ہوا۔ مصنف نے عرب قومیت کی برتری کا فلسفہ نمایاں کرنے کی غرض سے [illegible]

© rasailojaraid.com

کوشش کی تھی کہ اسلام جب تک عربوں میں رہا محفوظ اور صحیح سالم رہا، لیکن عجم میں پہنچ کر اس کی صورت مسخ ہو گئی، اور اس میں قسم قسم کی رنگ آمیزیاں شروع ہو گئیں۔ اسی سلسلے میں مصنف نے لکھا تھا کہ پوری تاریخ اسلام میں اگر عجم میں کسی نے اسلام کو صحیح سمجھا ہے تو وہ شیخ احمد سرہندی اور ڈاکٹر اقبال ہیں۔

اس ایک پہلو سے قطع نظر کتاب میں بہت سی مفید اور پر از معلومات باتیں بھی ہیں جن سے میں محظوظ ہوا۔ مثلاً قرآن مجید میں تورات، انجیل، اور زبور کے ساتھ صحف ابراہیم کا بھی ذکر ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اول الذکر کتابوں سے تو ہم واقف بھی ہیں۔ اور وہ دستیاب بھی ہیں۔ لیکن صحف ابراہیم کہاں ہیں؟ اس کے متعلق، جیسا کہ علامہ عبداللہ یوسف علی نے اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن کے ایک نوٹ میں لکھا ہے، میں صرف اس قدر جانتا تھا کہ اگرچہ عہد عتیق میں حضرت ابراہیم کو پیغمبر تسلیم کیا گیا ہے (Gen XX.7) لیکن صحیفۂ ابراہیم کے نام سے کوئی کتاب ہم تک نہیں پہنچی، البتہ لندن کی ایک مذہبی سوسائٹی نے ۱۹۲۷ء میں ایک کتاب "وصیت نامۂ ابراہیم" (The Testament of Abraham) کے نام سے شائع کی تھی جو یونانی زبان میں کسی کتاب کا ترجمہ تھی اور اس کو مسٹر جی۔ ایچ بوکس نے یونانی سے انگریزی میں منتقل کیا تھا، قیاس کیا جاتا ہے کہ اصل کتاب عبرانی زبان میں تھی اور پہلی صدی عیسوی میں اس کو مصر میں یونانی زبان کا لباس پہنایا گیا تھا، بس صحف ابراہیم کے متعلق مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ صرف اسی قدر تھا،

افسوس ہے ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی کی کتاب اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہے اس کو پڑھے ہوئے زمانہ ہو گیا، اس لیے اب مجھے یاد نہیں ہے کہ علامہ عبداللہ یوسف علی نے مسٹر بوکس کے جس انگریزی ترجمہ کا ذکر کیا ہے اسی کی بنیاد پر یا کسی اور ماخذ کی اساس پر ڈاکٹر فاروقی نے ایک کتاب کا ذکر کیا جس کو کسی زمانہ میں ایک بائبل سوسائٹی نے صحیفۂ ابراہیم [illegible] کے نام سے شائع کیا (The Book of Abraham)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتاب کے ذکر پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ یہ دکھانے کی غرض سے کہ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم سے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس میں اور اس صحیفہ کے بیانات میں کس درجہ مطابقت ہے، ڈاکٹر فاروقی نے یہ کیا کہ چند صفحات میں دو دو کالم بنا کر ایک کالم میں حضرت ابراہیم سے متعلق قرآنی آیات نقل کر دیں اور اس کے بالمقابل دوسرے کالم میں کتاب ابراہیم کے اقتباسات درج کر دیے، یہ بڑا عجیب و غریب انکشاف تھا، میں اس سے بہت محظوظ ہوا۔ میں نے دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا تو محسوس ہوا کہ اگرچہ بعض جزئی تفصیلات جو قرآن میں ہیں وہ کتاب ابراہیم میں نہیں ہیں اور بعض چیزیں جو کتاب میں ہیں وہ قرآن میں نہیں، لیکن جہاں تک بنیادی امور کا تعلق ہے دونوں کے بیانات میں بڑی حد تک مطابقت ہے اور اس سے قرآن مجید کا یہ دعویٰ ثابت ہو جاتا ہے:

اِنَّ ھٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ۝ صُحُفِ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی ۝ یہ جو کچھ اوپر گذرا ہے وہ صحف سابقہ میں موجود ہے، صحف ابراہیم و موسیٰ میں۔

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر اسماعیل الفاروقی بڑے فاضل اور اعلیٰ درجہ کے مصنف اور محقق ہیں، مذکورہ بالا کتاب کے علاوہ ان کی اور بھی چند کتابیں جو قابل مطالعہ ہیں اور ابھی پچھلے دنوں ایک بیرونی سفر میں ایک عزیز دوست سے جو امریکہ میں پانچ چھ برس رہ چکے تھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر فاروقی نے عرب قومیت سے متعلق اپنے سابقہ افکار و خیالات سے رجوع کر لیا ہے اور کتاب میں جو کچھ اس سلسلہ میں لکھا تھا اس پر خط نسخ کھینچ دیا ہے، مزید برآں اس دوست نے بتایا کہ اب ڈاکٹر صاحب موصوف کی مذہبی زندگی بھی بہت بہتر ہو گئی ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ فکر و عمل کی یہ تبدیلی خود ڈاکٹر صاحب کے اندرونی احساس کا

نتیجہ ہے یا "جمال ہمنشیں درمن اثر کرد" شیخ سعدی کے مصرعہ کے مطابق ان کی رفیقہ حیات کے افکار و نظریات کا کرشمہ!

...... ہوئیں تو حسن اتفاق سے یہ مقالہ میری ......

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چاہیے تھا تصور یہ تھا تمام مقالات پہلے ہی سات جلدوں میں چھاپ کر مندوبین میں تقسیم کیے گئے تھے اور وقت میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ مقالہ پورا پڑھا جائے اس لیے ہر مقالہ نگار کے لیے دس منٹ مقرر کر دیے گئے تھے کہ ان میں مقالہ کا خلاصہ بیان کر دے، اس قرارداد کے مطابق میں نے مقالہ کے ضروری اجزاء کو دس منٹ میں سمیٹ لینے کی کوشش کی، لیکن وقت پورا ہو گیا اور بعض اجزاء رہ گئے، محترم صدر اور جناب اے کے بروہی نے اسے محسوس کر لیا، اس لیے ٹھیک دس منٹ پر جب میں اپنی تقریر ختم کرنے لگا تو دونوں از راہ کرم ایک ساتھ بولے: "آپ کے لیے پانچ منٹ اور ہیں، تقریر جاری رکھیے"۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور پندرہ منٹ میں تقریر ختم کر دی۔ اس کے بعد میں ذرا ٹھہرا کہ شاید کوئی صاحب سوال کریں، مگر میرے مقالہ کا مضمون ہی ایسا تھا کہ اس پر کیا سوال ہو سکتا تھا، جب میں ڈائس سے اتر کر اپنی سیٹ کی طرف چلا تو بعض عرب اور دوسرے دوستوں نے مسکرا کر "جزاک اللہ" کہہ کر مقالہ کی پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اس کے بعد چند مقالات اور ہوئے، گیارہ بجے یہ سیشن ختم ہو گیا اب ہم سب لوگ چائے یا کافی کے لیے ایک بڑے ہال میں جمع ہوئے، اس کا دور نصف گھنٹہ تک چلتا رہا، ساڑھے گیارہ بجے دوسرا سیشن شروع ہوا۔ پہلے سے پروگرام کے مطابق اس کی صدارت میں نے کی، ڈیڑھ بجے یہ ختم ہو گیا، نماز پڑھی، کھانا کھایا اور دوستوں سے گپ شپ کی، لنچ میں ڈھائی کا عمل ہوا، گھنٹی بجی اور تیسرا سیشن شروع ہو گیا۔ اس کی صدارت ڈاکٹر سلطان ابو علی نے کی جو قاہرہ یونیورسٹی میں اقتصادیات کے پروفیسر ہیں، ساڑھے چار بجے یہ ختم ہوا۔ پانچ بجے چوتھا سیشن شروع ہوا، اور مغرب تک چلتا رہا، اس طرح دونوں کمیٹیوں کے دس دس سیشن ہوئے اور ہر سیشن میں سات آٹھ مقالات کا اوسط رہا، اس طرح کم و بیش ۱۴۰ مقالات پیش کیے گئے۔

مقالات کا معیار ان مقالات کا معیار کیا تھا؟ اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ کانفرنس کی مجلس منتظمہ نے ایک مقرر تاریخ تک جو مقالات اس کو وصول ہو چکے تھے ان کی جانچ پڑتال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لیے ایک اکسپرٹس کمیٹی بنائی تھی جس کے صدر خود جناب اے. کے (Scrutiny) بروہی صاحب تھے، اس کمیٹی نے تمام مقالات پڑھے اور ایک معیار قائم کیا، معیار یہ کہ کمیٹی نے تین درجات مقرر کیے A، B اور C پھر جو مقالات اول دو میں سے کسی درجہ میں آ گئے ان کا انتخاب کر لیا گیا اور مقالہ نگاروں کو کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ بھیج دیا گیا، اور جو مقالہ C کے درجہ میں آیا اس کو رد کر دیا گیا اور مقالہ نگار کو دعوت شرکت نہیں دی گئی، اسلام آباد میں ایک عزیز دوست جو ماہرین کی اس کمیٹی کے ممبر تھے ان سے معلوم ہوا کہ کتنے ہی مشاہیر ملت اور علمائے امت تھے جن کے مقالات مقررہ معیار پر پورے نہ اترے اور انھیں نامنظور کر دیا گیا، فاقی طور پر اس انکشاف پر مجھ کو کوئی اچنبھا نہیں ہوا، کیونکہ خود میرا تجربہ یہ ہے کہ اس نوع کی دانشوروں کی بین الاقوامی کانفرنسوں میں عموماً ان حضرات کو بھی مدعو کر لیا جاتا ہے جو اپنے ملک میں کسی سیاسی یا مذہبی جماعت کے صدر یا سکریٹری ہوتے ہیں، یا کسی بڑی مسجد میں امام یا خطیب کے فرائض انجام دیتے ہیں، یہ حضرات لیڈر قسم کی شہرت رکھتے ہیں، لیکن مطالعہ و تحقیق اور تصنیف و تالیف جو خاموشی سے پتّہ مارنے کا کام ہے اس سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب ان کو کسی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملتا ہے تو کسی طالب علم سے اکثر مفت اور کبھی پیسے دے دلا کر مضمون لکھوا لیتے ہیں اور اسے اپنے نام سے پڑھ ڈالتے ہیں، آپ جانتے بے گار کا کام اور وہ بھی ایک طالب علم کا کیا ہوا! معیاری کیسے ہو جائے گا؟

میرے مقالہ کا معیار | اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ خود میرے مقالہ کا معیار کیا تھا؟ تو میں گذارش کروں گا یہ تو ظاہر ہے کہ مقالہ کم از کم دوسرے درجہ یعنی بی کلاس کا تو تھا ہی، جبھی تو انتخاب میں آ گیا، لیکن اگر ماہرین کی کمیٹی مجھ سے کہتی کہ میں خود اپنے مقالہ کا درجہ متعین کر دوں تو یقین کیجیے میں اس کو سی (C) کلاس سے زیادہ کا درجہ ہرگز نہ دیتا کیونکہ اول تو میں جب رفیقۂ حیات کے انتقال کے باعث سخت ملول و دل گرفتہ اور پراگندگیٔ قلب و دماغ کا شکار تھا ——————

اصحاب بھی ہوں کہ یہ غم جیون ساتھی ہے   اس وقت میں نے یہ مقالہ صرف ایفائے عہد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی شرم میں لکھا تھا اور اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ خدا نے میری طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ میری نظر ہمیشہ دوسروں کے محاسن پر رہتی ہے اور ان کی کوتاہیوں اور معائب سے صرف نظر کرتا ہوں، اس کے برعکس جہاں تک میری اپنی ذات کا تعلق ہے اس کے نقائص ہمیشہ میرے پیش نظر رہتے ہیں اور میرا ذوق خوب سے خوب ترکی جستجو میں سرگرداں رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ لکھنے کے بعد میں اپنے مضمون پر نظر ثانی بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ اگر کروں تو اس میں کانٹ چھانٹ کرنی ہوگی اور اس کا سلسلہ کبھی ختم ہی نہ ہوگا۔ اسی طرح دنیا بھر کی کتابیں پڑھتا رہتا ہوں لیکن اپنی چھپی ہوئی کسی کتاب کو اٹھا کر پڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی، یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کتاب پڑھوں گا تو اس کے نقائص سامنے آئیں گے کہ یہاں اس لفظ کے بجائے فلاں لفظ اور اس جملہ کے بدلہ میں کوئی اور جملہ ہونا چاہیے تھا، یہ حوالہ ثانوی درجہ کا ہے، اس سے بہتر حوالہ ہونا چاہیے، وغیرہ وغیرہ اور اس سے طبیعت بدمزہ ہوگی، آخر انسان بہرحال ناقص اور اس کا ہر کام ادھورا اور ناقص ہے۔ پھر میرے دماغ پر دنیا کی ناپائیداری، فنا، حدوث اور بشری نقص کے تصور کا اس درجہ استیلا اور غلبہ ہے کہ آپ میری لائبریری میں ہر قسم کی کتابیں اور مجلات و رسائل پائیں گے جو خوبصورت الماریوں میں کچھ ترتیب سے اور کچھ بے ترتیبی سے محفوظ ہیں لیکن ان میں آپ تلاش کریں گے تو نہ میری کسی کتاب کا کوئی نسخہ آپ کو ملے گا، نہ میرے کسی مقالہ کی کوئی کاپی ملے گی، خدا جھوٹ نہ بلوائے، ریڈیو پر دو سو ڈھائی سو سے کم میری تقریریں نہیں ہوئیں اور وہ بھی مذہبی۔ ادبی اور تاریخی، تقسیم سے پہلے آغا محمد اشرف اور ن۔ م۔ راشد علی الترتیب اردو پروگرام کے انچارج تھے اور دونوں میرے دوست تھے اس لیے ان کے زمانہ میں میری تین چار تقریریں ہر مہینہ ہو جاتی تھیں، بلکہ بعض اوقات ایک ہی موضوع پر مسلسل کئی کئی تقریریں ہوتیں، مثلاً ایک مرتبہ "دلی کے سات شہر" پر میں نے ایک سیریز براڈکاسٹ کی۔ مگر میرے پاس ایک تقریر کی نقل بھی نہیں ہے، یہ سب کچھ کیوں؟ محض اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں، یہ دنیا فانی ہے، میں فانی ہوں، اور میری ہر چیز فانی ہے، جب یہ ہے تو پانی کے بلبلوں کو تم اس میں محفوظ کرنے کی کوشش کون سی

© rasailojaraid.com